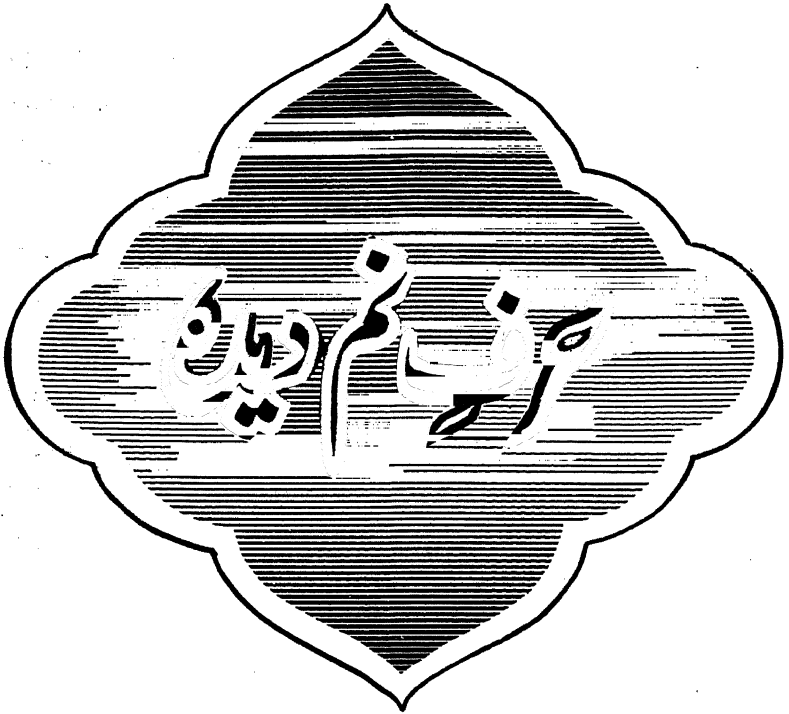


بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ



كَأَكْثَرُ مُحَمَّدٍ عَلَى أَثَرٍ

جملہ حقوق بحق راحت اثر محفوظ

زیر اہتمام :	ادارہ شعر و حکمت حیدرآباد
سنہ اشاعت :	۱۹۹۰ء مطابق ۱۴۱۱ھ
مطبع :	ٹمل ناڈو اردو پبلیکیشنز مدراس ۲
تعداد :	۷۸۶
قیمت :	چالیس روپے۔
کتابت :	اسد شمیم
سرورق :	قیصر سرمست
اندرونی سرورق :	سلام خوشنویس
ترتیب و انتخاب :	سید بشارت علی
ترژمین :	عقیق الرحمن ظفر
ناشر :	مڈاس اکیڈمی۔ فصیح جنگ لین۔ معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد۔



ملنے کے تھے:

کاشانہ اثر، ۹/۲۲۶-۳-۲۰ محبوب چوک۔ حیدرآباد ۲
 علیم صبا نویدی، ۱۲۶ امیر النساء بیگم اسٹریٹ، مدراس ۲
 ماڈرن چہلی کیشنز ہاؤس، گولہ مارکیٹ، دریا گنج، دہلی
 مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی۔ بمبئی علی گڑھ۔

انتخاب

برادرِ محترم
ڈاکٹر معین الدین عقیل
(استاد شعبہ اُردو، کراچی یونیورسٹی)

اور

محَبِ مکرم
جناب محمد سراج الدین
(سکریٹری میڈیسن، کینڈی، حیدرآباد)

کے نام

نام	:	محمد علی اثر
تاریخ پیدائش	:	۲۲ / دسمبر ۱۹۳۹ء
تعلیم	:	ایم اے (گولڈ میڈلسٹ)
		پی ایچ ڈی
ملازمت	:	مخطوطہ شناسی کا پوسٹ، ایم اے ڈپلوما ریڈر شعبہ اردو (عثمانیہ یونیورسٹی) وہمنس کالج، کوٹھی، حیدرآباد

تبدلی ۲۵
کبھی مقتل، کبھی محفل ٹہرا ۲۶

عصری تقاضا ۲

جتنی شہرت اتنی ہی رسوائیاں ۲۸

توکل ۲۹

نظر سے دور ہے پھر بھی نظر میں رہتا ہے ۵۰

راہ نما ۵۱

جیسے مہکی ہوئی یادوں کا، سو جھونکا کوئی ۵۲

مناجات ۵۳

خیال یار وہ سورج جو ڈوبتا ہی نہیں ۵۵

طیر آوارہ ۵۷

دن کا ماتم ہے، روشنی کم ہے ۵۸

تسلی ۶۰

مانس لیتا ہوا بے برگ شجر کیسا ہے ۶۱

ڈاکٹر زور کی نذر ۶۳

ستارے بھر رہے ہیں زندگی تقسیم ہوتی ہے ۶۴

جنگل میں صداؤں کے سنائی نہیں دیتا ۶۵

منظر بدل ڈالو ۶۷

کسی کا نقش جو پل بھر رہا ہے آنکھوں میں ۶۸

سیرس ٹاور ۶۹

یہ دیکھنا ہے کہ کس سمت جا نکلتی ہے ۷۰

نصاب عقل کا اک باب ۷۲

آغاز انوکھا، ہو تو انجام نیا، ہو ۷۳

وہ اصل حقیقت ہے ۷۴

منظر ایسا بھی سہانا تھا وہاں ۷۵

خواہ تمکنت کی یاد میں ۷۶

کتبہ ۷۸

ہم کربِ مسلسل سے گذر کیوں نہیں جاتے ۷۹

زوال ۸۰

غزلِ مزاج ہے، یکسر غزل کا لہجہ ہے ۸۱

دو نظمیں ۸۳

آنگنوں میں آؤ نگھٹا ہے سورج ۸۴

اے زرنگار نور --- ۸۶

نقد و تحقیق کی راہوں میں اُجالے ہوں گے ۸۹

انعام ۹۱

راہِ نجات ۹۱

دوستوں سے عمر بھر لڑتے رہے ۹۲

ذوقِ مطالعہ ۹۳

دلوں کے درد کا رشتہ مری تلاش میں ہے ۹۴

متاعِ عمر گزشتہ سمیٹ کر لے جا ۹۵

تم اتنا جانتے ہو تو ۹۷

کتنی راتوں سے جل رہا ہوں میں ۹۸

فاصلہ ۱۰۰

نذرِ جامی ۱۰۱

گنگناتی ہے غزل گاتی ہے ۱۰۲

ایک نظم ۱۰۳

تو جو احساس پہ ہرائے گا آنچل بن کر ۱۰۴

اک حسین یاد پھر ساتھ چلنے لگی ۱۰۶

پرانے تماشے ۱۰۷

ٹوٹے ہوئے الفاظ کو آہنگِ نیا دے ۱۰۸

ٹوٹ کر رہ گیا آئینے سے رشتہ اپنا ۱۱۰

قطعہ تاریخِ طباعت ۱۱۱

محقق شاعر

ڈاکٹر محمد علی اثرائتی نسل کے ممتاز ترین محقق و کئیات ہیں۔ دکنی غزل پر ان کی کتاب اپنے موضوع پر سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے لیکن وہ بڑے محقق ہی نہیں فن کار بھی ہیں۔ ان کا تخلص ان کی سخنوری کا غماز ہے۔ ادرمجے ان کی چند شعری تخلیقات دیکھنے کا اتفاق ہوا جس سے یہ تاثر ملا کہ اگر وہ تحقیق نہ کرتے اور محض شاعری کے رہیں ہو جاتے تو اس کو بچے میں بھی اپنا مقام مسلم کرالیتے، لیکن فی الحال ان کی تحقیقی شخصیت نے ان کی شاعرانہ شخصیت کو دبا دیا ہے۔

ادرجے سچے وہ امریکہ رہ کر آئے ہیں۔ شاید بیماری کے علاج کے سلسلہ میں آج کے دور میں ہر شخص یوں بھی پریشان رہتا ہے جسے ایک شدید بیماری لاحق رہی ہو اسکا قنوطی ہونا اور بھی لازمی ہے۔ اور یہ رنگ ان کے کلام میں بھی جھلکتا ہے۔ نظم ”قادر مطلق بنا“ میں وہ مشیت سے شاک کی نظر آتے ہیں۔

زندگی بھرا الجھنیں ہی الجھنیں —

اور

بد مرگ نازل ہو عذاب

ایک مشت خاک کی خاطر ہیں کیا کیا اہتمام ... !

لیکن پھر مذہب کا سہارا لیتے ہیں اور نظم ”پہلا قدم“ میں کہتے ہیں

اُسی کا نام لیں

پہلا قدم رکھیں

بے بسی اور پسپائی کا یہ رنگ غزلوں میں اور نمایاں ہو کر جھلکتا ہے۔

کوئی چہرہ بھی دکھائی نہیں دیتا مجھ کو

یہ دھواں دیکھتے تا حد نظر کیا ہے

تیرہ بختوں کی نگاہوں میں کہاں ہے سورج

شب کا افسانہ یہ عنوانِ سحر کیا ہے

قدم قدم پہ چراغوں کی سانس رکتی ہے
 کہ اب تو شہروں میں جینا عذاب لگتے ہے
 کہیں کہیں وہ سماج کی موجودہ صورتحال پر فکر و نظر کی گہرائی کے ساتھ تبصرہ کرتے ہیں
 اچھی آنکھ سے جہذب کا سفر کیا
 تو اپنے آپ کو تاریخ کے ادھر لے جا

کب تک یوں ہی بھٹکیں گے حتماً کے مسافر
 ماضی کے سمندر میں اتر کیوں نہیں جاتے

جدید شاعری نے حسن و عشق کے موضوع کو عینیت اور تخلیقیت سے آزاد کرایا ہے اثر بھی کہیں اس
 انداز سے لگتے ہیں جس میں تجربے اور مشاہدے کی تازگی ہے۔

وہ ایک لڑکی جسے زعم خود شناسی ہے کلاس روم سے اکثر خفا نکلتی ہے
 وہ بن سنور کے نکلتی ہے جس گھڑی گھر سے خموشیوں کے بھی لب سے صدا نکلتی ہے
 مندرجہ بالا شعر پڑھ کر اقبال کے اس شعر کی یاد ناگزیر ہے

وہ مست ناز جو گلشن میں آنکلتی ہے
 کلی کلی کی زباں سے دعا نکلتی ہے

اور جب وہ اپنی اداس رومانیت کو عالمانہ لفظیات کے ساتھ بیان کرتے ہیں تو انکا ڈکشن اختصار عارف کی یا
 دلاتا ہے
 ہر ایک اشک ہے دیباچہ تیری یادوں کا
 کھلی ہوئی ہے غموں کی کتاب آنکھوں میں
 کتاب عشق کا عنوان تو مٹ گیا لیکن
 لکھا ہوا ہے ابھی انتساب آنکھوں میں
 چہار سمت ہیں ابیات زندگی روشن
 بنا ہے جب سے کوئی خوش نصاب آنکھوں میں

ان اشعار کو دیکھ کر کون اس سے انکار کر سکتا ہے کہ تحقیق کو بھلا دیا جائے تو بطور شاعر انہیں یاد رکھنا

پڑے گا۔ لیکس وہ شعر میں بھی کبھی کبھی اپنی تحقیقی شخصیت کی یاد دلاتے ہیں۔ مثلاً ذیل کے مکتبی اشعار میں سے

تنقید کی بنیاد میں تحقیق چھپی ہے
تشکیک کی راہوں سے حقائق کا پتہ دے
علم و تحقیق کا سرمایہ دکن سے نکلا
ہر نیا باب قطب شاہ کے فن سے نکلا
کس عرق ریزی سے مخطوطہ شناسی کی ہے
کیسے کیسے دُرِ نایاب نکالے ہونگے
ق

ایک ایک لفظ کے سینے میں اترنے کے لئے
کتنے دیمک زدہ اوراق کھنگالے ہوں گے
یہ تحقیقی عمل تھا۔ میں ذیل کے شعر کا اطلاق شعر کے تخلیقی عمل پر کر دوں گا۔
جاگتی آنکھوں کی تحریر سمجھ میں آئی
سرد کمرے میں جو اک شعلہ بدن سے نکلا
اپنے تاثرات کو ذیل کے پرکینا شعائر پر ختم کرتا ہوں سے

ہر رات لکھا کرتے ہیں پریوں کی کہانی
اور صبح کو اوراق نظر آتے ہیں سادے

بچے بچتے بچتے افق پر سورج نے
ایک تازہ غزل بھی ہے ابھی

ڈاکٹر گیان چند جین

سابق پروفیسر و صدر شعبہ اردو
حیدرآباد سنٹرل یونیورسٹی

۱۳ جولائی ۱۹۹۹ء
۹/۲۵ اندرا نگر - بھنڈ

حرفِ نم دیدہ کا شاعر

ڈاکٹر محمد علی اثر قدیم اردو (دکنیات) میں غاصد رک رکھتے ہیں لیکن شعر کہتے ہیں نئے رنگ اور جدید انداز کے۔ شکر ہے کہ جدیدیت کے بے ڈھنگے پن سے انہوں نے اپنا دامن بچائے رکھا ہے۔ اور یہ کچھ نہیں صرف اس وجہ سے کہ ان کی شخصیت اور فن پر اردو کی شعری روایات اور کلاسیکیت کی گرفت مضبوط ہے۔ اثر کا ایک شعری مجموعہ ”ملاقات“ شائع ہو چکا ہے اور اب وہ اپنا دوسرا شعری مجموعہ ”حرفِ نم دیدہ“ پیش کر رہے ہیں۔

دکنیات سے غیر معمولی شغف کے باعث ڈاکٹر اثر کی کلاسیکل شاعری اور شعریات پر گہری نظر ہے۔ وہ ہماری تہذیبی قدروں سے بھی آشنا ہیں اور اردو کی شعری روایات سے بہرہ ور بھی۔ ان کے پاس جذبہ و احساس کی ندرت بھی ہے اور فکر کا قدرے بانگن بھی۔۔۔ زبان و بیان اور فن کی پابندیوں کا تو وہ لحاظ ہی ہیں۔ شعر سنبل سنبل کر کہنے کی وجہ سے ان کے لہجہ میں کھٹک اور توانائی کا احساس ہوتا ہے اور بعض اشعار تو بڑے طرہ دار اور خوبصورت ہیں۔ یہ چند شعرے

تو جا رہا ہے تو میری سسکتی آنکھوں سے
سلگتی شام ، پگھلتی ہوئی سحر لے جا

اچھلتی آنکھ سے تہذیب کا سفر کیا
نوائے آپ کو تاریخ کے ادھر لے جا

جس سے سینوں میں پھول کھل جائیں
زخم ایسے بھی کچھ عطا کر دے

خوشی اس امر کی ہے کہ ڈاکٹر اثر عصری رجحانات، موضوعات اور مسائل پر بھی گہری نظر رکھتے ہیں اور اپنے اطراف و اکناف سے خاصے باخبر ہیں۔ نظموں سے قطع نظر، جن میں بالعموم معاشرے کے درد و کرب اور زندگی و زمانہ کے بیچ و خم کی ترجمانی زیادہ ہوتی ہے، اثر کی غزلوں میں بھی اپنے دور کی دل کی دھڑکنوں کو باآسانی محسوس کیا جاسکتا ہے۔ میں یہاں پہلے ان کی منظومات کا حوالہ دوں گا۔ ”قادر مطلق بتا؟“، ”راہ نجات“ اور ”مناجات“ جیسی مختصر ترین اور مختصر منظومات میں انہوں نے نہایت جامعیت کے ساتھ اور موثر انداز میں اپنی بات کہی ہے اور یہ ہے نظم ”اند میرے کی تحریر“ آپ خود ملاحظہ فرمائیں۔

دھواں ہیں گنبد و مینار کی ساری فضا میں
کس کے رنگ

مدد مہم پڑ رہے ہیں
شعاعوں کا سفر جاری ہے
لیکن

اند میرا بڑھتا جا رہا ہے
نگاہیں روشنی کی منتظر ہیں۔۔

و نیز ”مادر مہرباں“، ”ہلا قدم“ اور ”راہ نما بھی اچھی مختصر نظمیں ہیں۔ غزلوں کے اشعار میں بھی ڈاکٹر اثر نے عصری زندگی کے کرب و بلا، غم و غصہ اور معاشرہ کی بے بسی کو اپنے طویل پر عمدہ انداز میں منعکس کرنے کی سعی کی ہے۔ یہ اشعار پڑنے سے تعلق رکھتے ہیں۔

اُگے ہیں زخم کی صورت گلاب آنکموں میں
چمپائے پھرتے ہیں صدیوں کے خواب آنکموں میں

موت شہروں میں پھری ہے اثر
خیریت پوچھ کر گئی ہے ابھی

قدم قدم پہ چراغوں کی سانس رکتی ہے
کہ اب تو شہروں میں جینا عذاب لگتا ہے

اب اپنی تشنہ لبی پر نہ جانے گا اثر
سمندروں کا محافظ بھی آج پیاسا ہے

ڈاکٹر اثر کو ادھر امریکہ میں بھی قیام کا موقع ملا۔ مغربی زندگی اور معاشرت کو انہوں نے قریب سے دیکھا اور محسوس کیا اور جہاں تہاں اس کو اپنی شاعری میں سمونے کی کوشش بھی کی ہے۔ ان کے اشعار پڑھئے، کہیں کہیں بین السطور اس کا احساس ہوگا۔ وہ مغرب کے بارے میں بھی اپنے مطالعہ اور تاثرات کو کاٹم لائیں اور اپنے وژن کو نیا رنگ دیں۔ ایسی توقع کی جانی چاہئے۔

اثر کا جاہلیاتی ذوق رچا ہوا ہے۔ جس میں دکنی شاعری کے نشاطیہ عناصر کی بہریں ملتی ہیں قابل مبارک باد ہیں کہ انہوں نے اپنا چراغ جلاتے ہوئے مغرب و مشرق اور قدیم و جدید سب سے استفادہ کیا ہے۔ یہ کیفیت جوں جوں فروں ہوتی جائے گی، ان کی شاعری اور نکھرے گی اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان کی انفرادیت میں اس نکھار کا حصہ بھی ہوگا۔ ”حرف نم دیدہ“ کی اشاعت پر میں ڈاکٹر محمد علی اثر کو مبارکباد دیتا ہوں۔

۳۱ اکتوبر ۱۹۹۰ء

(ڈاکٹر) سلیمان اظہر جاوید

پروفیسر شعبہ اردو

ایس۔ وی یونیورسٹی، تروپتی (اے۔ پی)

تاثرات



محمد علی اشراقی غزل گو شاعر ہیں۔ ان کی غزل کا اسلوب اس روایت سے منسلک ہے جسے ناصر کاظمی نے پروان چڑھایا تھا۔ اثر جذبے اور خیال کے بیان پر محسوسات اور کیفیات کے ایمانی اور استعاراتی اظہار کو ترجیح دیتے ہیں اور پیکر تراشی سے کام لیتے ہیں۔ اس مجموعے کی غزلوں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنا الجھ پالچھ ہیں اور جلد ہی اپنی شناخت بنالیں گے۔ انہوں نے مختصر نظمیں بھی لکھی ہیں جو اپنے اختصار اور ایمائیت کی وجہ سے فوری تاثر کو ابھارتی ہیں۔

(ڈاکٹر) مغنی تبسم
سابق پروفیسر و صدر شعبہ اردو
عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد

۲۱ اکتوبر ۱۹۹۰ء



”ڈاکٹر محمد علی اثر“ نہ صرف دکنی ادب کے بڑے محقق ہیں بلکہ دکنی کچھر کی روح اور اس کی فضاء ان کی شاعری میں ایک ایسا خوبصورت رنگ پیدا کرتی ہے جو آنکھوں کو بھاتا ہے اور دل میں اتر جاتا ہے۔ جناب اثر روایتی شاعر نہیں ہیں عہد حاضر کی روح ان کی شاعری میں، بلبل خوشنوا، کی طرح، زندگی کے تناور درخت کی شاخوں پر چہکتی ہے۔ ان کی لفظیات جدید ہے ان کا لہجہ لوچ دار اور موثر ہے۔ غزل میں ایسے شعر ڈاکٹر اثر ہی کہہ سکتے ہیں۔

علم و تحقیق کا سرمایہ دکن سے نکلا
ہر نیاب قطب شاہ کے فن سے نکلا

چہار سمت ہیں ابیاتِ زندگی روشن !
بسا ہے جب سے کوئی خوش نصاب آنکھوں میں

میں ان کی شاعری کا ان کی تحقیق کی طرح قائل ہوں۔

ڈاکٹر جمیل جالبی

۱۸ ستمبر ۱۹۹۱ء

صدر نشین مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد۔

حمزہ



یہ مرا جسم اور جاں تجھ سے
آرزوؤں کا گلستاں تجھ سے

بے نہایت عنایتیں تیری!
فکر و دانش کا اک جہاں تجھ سے

ٹوٹی ساعتوں کے صحرا میں
زندگانی کا ہر شاں تجھ سے

لا مکاں پر ترا تضرع ہے ۔
اور سارے زماں مکاں تجھ سے

رحم فرما زمین والوں پر
شش جہت ہفت آسماں تجھ سے

آدمیت کی سرفرازی ہو
ابنِ آدم ہے صوفشاں تجھ سے

ہفت افلاک ہفت ہی اشعار
ہے اشر کا قلم رواں تجھ سے



نور



— خدا بھی فدا محمد کا
کیا کہیں مرتبہ محمد کا

دل کے آنگن میں روشنی اتری
نام ہے ۔۔ بھی یا محمد کا

ہر زمانے کی آنکھ نے چوما
جب ملا نقشِ پا محمد کا

منزلِ حق اُسے نصیب ہوئی
جس نے کلمہ پڑھا محمد کا

کیسے دو نیم ہو گیا تھا مگر
بجانب اشارہ ہوا محمد کا

جس کو انا ہے وہ ادھر آئے
سدا در کھلا محمد کا

جس طرف سچ کی روشنی ہے اثر
ہے ادھر راستہ محمد کا



پہلا قدم



نیارستہ —

اکیلا پن

سفر سے بھی منفرکب ہے

اُسی کا نام لیں

پہلا قدم رکھیں

••



یا میرِ عرشِ راستہ کر دے
یا میرے دل کی آنکھ وا کر دے

پتھروں میں بھی پھول ہسکیں گے
پہلے اس دل کو آئینہ کر دے

آزروؤں کی خشتِ شانوں کو
سبزیتا کوئی عطا کر دے

چار دن کی یہ زندگی کب تک؟
پانچویں دن سے آشنا کر دے

جس سے سینوں میں پھول کھل جائیں
زخم ایسے بھی کچھ عطا کر دے

لفظ و معنی میں ہو آتش پیدا
کچھ تو ایسا میرے خدا کر دے





سامنے خنجر رکھ کر دیکھیں
دل ہے پھول کہ پتھر دیکھیں

قطرے میں دریا کو سمو کر
جزو میں کل کا منظر دیکھیں

اپنی قسامت اپنا چہرہ
خود سے دُور لکل کر دیکھیں

آگ ہے دونوں کی آنکھوں میں
جلتا ہے کس کا گھر دیکھیں

اب کیا نام کی زیبائش ہی
ہر گھر کی تختی پر دیکھیں

آنکھ میں جب چہرہ ہو تیرا
اپنا چہرہ کیوں کر دیکھیں

گم گشتہ خوشبو کا چہرہ
دردِ دھونڈیں گھر گھر دیکھیں

کس سے باتیں کرتا ہے وہ
تنہائی میں چھپ کر دیکھیں

رات کی باہنوں میں کھو جائیں
خواب سہانے جی بھر دیکھیں

ایک۔۔۔ جزیرہ ہو اور، ہم تم
چاروں اور سمتِ درد دیکھیں!

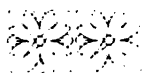
شبِ نیم سے بھی نازک ہے وہ
نظروں ہی سے چھو کر دیکھیں

سالولی رنگت اچھب البیلی
آئیے میں بس کر دیکھیں

دم خم ہے آندھی میں کتنا
آودیا ہے۔ جلا کر دیکھیں!

ہم سے کیسے ملتا ہے وہ
خواب میں اس کے جا کر دیکھیں

آنکھیں منظر میں ڈوبی ہیں
آپ اثر پس منظر دیکھیں



اندھیرے کی تحریر



دھواں ہیں گنبد و مینار کی ساری فضا میں
کلس کے رنگ

مدھم پڑ رہے ہیں
شعاعوں کا سفر جاری ہے
لیکن

اندھیرا ہے کہ بڑھتا جا رہا ہے
نگاہیں روشنی کی منتظر ہیں

••



شام کارنگ - چمپڑ ہے ابھی
دن کے چہرے پہ تازگی ہے ابھی

تو مِلا بھی تو یوں ہوا محسوس!
نیسے مجھ میں کوئی کمی ہے ابھی

بجھتے بجھتے اُفق پہ سورج نے
ایک تازہ غزل کہی - ہے ابھی

مٹ چکے ہیں اگرچہ نقشِ قدم
ایک آواز آرہی ہے ابھی

غم کی پلکوں پہ عکس لرزاں ہیں
صبح شاید کٹی پھٹی ہے ابھی

چاند بادل میں جھپ گیا۔ مگر
میری آنکھوں میں روشنی ہے ابھی

موت شہروں میں پھر رہی ہے اثر
خیر ۔۔۔ پوچھ کر گئی ہے ابھی

مادرِ مہربان



زمینِ ماں ہے
 ہماری آنکھ لگنے تک —
 کھلاتی اور پلاتی ہے
 پھر اپنی گود میں
 آرام سے سب کو سلاتی ہے۔

••



آنسوؤں میں کبھی ڈھلی ہے رات
دردِ بن کے کبھی اُٹھی ہے رات

کوئی سوچ کہیں سے آجائے
کتنی دیران ہو گئی ہے رات

صبح سے ہم کلام ہونے کو
”زمینہ زمینہ اتر رہی ہے رات“

پھر اُجالوں کا غول ہوا شاید
قتل گاہوں میں بٹا گئی ہے رات

دل میں کہرام کم نہ ہوگا اثر
تم بھی سو جاؤ سو گئی ہے رات

شانِ خرم



ایسے چل پڑو
نقشِ قدم چھوڑو
وہ خود اگے رہ گزر بن جائیں گے آخر

••



اُگے ہیں زخم کی صورت گلاب آنکھوں میں
چھپائے پھرتے ہیں صدیوں کے خواب آنکھوں میں

کتابِ عشق کا عنوان تو مٹ گیا لیکن
لکھا ہوا ہے ابھی انتساب آنکھوں میں

ہر ایک اشک ہے دیباچہ تیسری یادوں کا
”کھلی ہوئی ہے غموں کی کتاب آنکھوں میں“

گئی رتوں کا ہر اک نقش جگمگاتا ہے
مثالِ بزم و مہ و آفتاب آنکھوں میں

چہار سہستہ ہیں ایسا تـ زندگی روشن
بسا ہے جب سے کوئی خوش نصیب آنکھوں میں

پلک پلک پہ فزواں تھے جس سے ماہ و نجوم
دھواں دھواں ہے وہی ایک اب آنکھوں میں

سپردگی کا وہ منظر بہ وقتِ شام و دُعا
سمٹ کے رہ گئے سارے حجاب آنکھوں میں

عجیب شخص ہے ہونٹوں سے کوئی کام نہ لے
ہر اک سوال کا رکھ دے جواب آنکھوں میں

کہیں ببول کہیں پر گلاب کی صورت
ہیں دھوپ چھاؤں کی مانند خواب آنکھوں میں

ہر ایک حرف ہے نم دیدہ لفظ لفظ ادا اس !
 لکھی ہے کس نے یہ تحریر آب آنکھوں میں

جدھر بھی دیکھوں ادھر نور کا سمندر ہے
 پھپھا ہے جب سے کوئی لعن اب آنکھوں میں

یہ سوچتا ہوں کہ بابِ اثر کھلے نہ کھلے
 زمیں کی گرد ہے خانہ خراب ۔ آنکھوں میں

البسے



عمرِ رفتہ کے ریشمی لمحے —
 دھند میں کھو گئے دھواں بن کر
 نغمہ و رنگ کے سبھی موسم
 رہ گئے ذہن میں خزاں بن کر
 بن گیا حال کتبہ ماضی
 کیسی دنیا ہے اس کا ہر منظر
 سنگ بستہ عذاب لگتا ہے
 آنسوؤں کی کتاب لگتا ہے

تین شعر



آنکھوں سے کوئی خواب نکلنے نہیں دے گا
احساس ترا مجھ کو پگھلنے نہیں دے گا

باہر کی ہوائیں تو بہت شور کریں گی
دروازہ مگر گھر سے نکلنے نہیں دے گا

یادوں کے گلابوں سے مہکتا ہوا راستہ
دو گام سنبھل کر مجھے چلنے نہیں دے گا

ہاں شاد



دوستوں کی رفاقتیں بھی درست

بھول جانے کا غم سوا، لیکن

یاد رکھیں تو وسوسے ہیں بہت

آنکھ، چہرہ، نظر کہاں سے لائیں

اپنے ہی گھر چلیں

ملیں سب سے

ہم میں اک دوسرا ہی بستا ہے

سیج ہے وہ ہم سبھوں سے اچھا ہے



علم و تحقیق کا سرمایہ دکن سے نکلا
ہر نیا باب قلم شاہ کے فن سے نکلا

بارش سنگ میں پھولوں کو بچانے والا
برگہ - آوارہ کی مانند چمن سے نکلا

ہرنئی رت نے اڑائی ہے صباحت تیری
ہر نیا رنگ ترے سالو لے پن سے نکلا

میرے ہمراہ فقط گردِ سفر تھی پھر بھی
سُرخ رو ہوتا گیا میں جو وطن سے نکلا

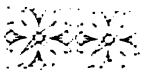
اس میں فرقت کی کھٹک ہے نہ رفاقت کی ہبک
کیسا انداز مرے طرزِ سخن سے نکلا

تیرے دیوانے کی آنکھوں میں تھی عنائی عجب
صبح دم جب تری زلفوں کی شکن سے نکلا

اپنے بدلے ہوئے لہجے پہ نہ اترائیں جناب!
ہر نیا جادہ کسی راہِ کہن سے نکلا

جاگتی آنکھوں کی تحریرِ سمجھ میں آئی
سرد کرے میں جواک شعلہ بدن سے نکلا

کتنے افسانے تراشے ہیں زمانے نے اثر
بے خیالی میں جواک نامِ دہن سے نکلا



قادرِ مروتِ ملق بتا؟



زندگی بھرا الجھنیں ہی الجھنیں —

اور

بعدِ مرگ نازل ہو عذاب
ایک مشّتِ خاک کی خاطر میں کیا کیا اہتمام

حالِ محترم میر فرید الدین حسین کی یاد میں



مرے وجود سے آتی ہے اک صدا مجھ کو
کہ میرے جسم سے کرے کوئی جدا مجھ کو

مری تلاش کا حاصل فقط تحیر ہے
میں کھو گیا ہوں کہاں خود نہیں پتا مجھ کو

میں اپنے جسم کے اندر سملے بیٹھا ہوں
بلارہا ہے کہیں دور سے خدا مجھ کو

میں تجھ کو دیکھوں مگر گفتگو نہ کر پاؤں
خدا کے واسطے ایسی نہ دے سزا مجھ کو

وہ لہجہ اب بھی تصور میں گونجتا ہے اثر
وہ چہرہ اب بھی دکھاتا ہے آئینہ مجھ کو

الحیث



چاہتیں!

ایک ایسا عمل ہیں

جنہیں

آپ ہم کب سے دہرا رہے ہیں

اسے خون کا سلسلہ

اور مٹی کی تقدیس کا ربط

انظہار کے واسطوں کا تسلسل ہی کہیے

مگر

کس کو جہلت کہ

فرسودہ باتوں پہ کچھ دھیان دے

••



ہر طرف رات کا پھیلا ہوا دریا دیکھوں
کس طرف جاؤں کہاں ٹہروں کہ چہرہ دیکھوں

کس جگہ ٹہروں کہ ماضی کا سراپا دیکھوں
اپنے قدموں کے نشاں پر تراستہ دیکھوں

کب سے میں جاگ رہا ہوں یہ بتاؤں کیسے
آنکھ لگ جائے تو ممکن ہے سویرا دیکھوں

ناخدا ذات کی پتوار سنبھالے رکھنا
جب ہوا تیز چلے خود کو شکستہ دیکھوں

دن جو ڈھل جاے تو پھر درد کوئی جاگ اٹھے
شام ہو جاے تو پھر آپ کا رستہ دیکھوں

اب یہ عالم ہے کہ تنہائی ہی تنہائی ہے
یہ تمنا تھی کبھی خود کو بھی تنہا دیکھوں

دیدہ خواب کو اُمیدِ ملاقات نہ دے
کس طرح اپنے ہی خوابوں کو سسکتا دیکھوں

رنگِ دھل جائیں غبارِ غم ہستی کے اثر
اب کے منظر کوئی دیکھوں تو انوکھا دیکھوں

تبریدی



اُترتی شام کے زینے پہ

رُک کر

نئے دن کا کوئی منظر تو دیکھیں

ذرا یکساں فضا کا کرب ٹوٹے



کبھی مقتل، کبھی محفل ٹھہرا
اک جزیرا جو مراد دل ٹھہرا

جس کو اک عمر بھلایا ہم نے
اب۔۔ وہی فکر کا حاصل ٹھہرا

کتنے چہرے تھے برابر لیکن
ایک چہرہ ہی مقابل ٹھہرا

دل میں طوفان اٹھے ہیں کیا کیا
جب سفینہ لب ساحل ٹھہرا

شاعری جس کا اشارہ ہے اثر
وہی جادہ، وہی منزل ٹھہرا

عصری تقاضا



اِسے دیکھو

اِسے لکھو

اِسے احساس کے دامن میں بھر لو
یہی تخلیق کا عصری تقاضا ہے

••



جتنی شہرت اتنی ہی رسوائیاں
انجمن کے نام پر تنہا ئیاں

لمس کی خوشبو بدن کی چاندنی
روشنی کی ہیں بہار آرائیاں

جیسے انساں کا مقدر ہو گئیں
بے یقینی، رنج، تنہائیاں

آسمانوں کا سفر صدیوں کی گونج
روشنی کی ہر طرف پر چھائیاں

وہ ملاقاتیں مدار تیں گئیں
ساتھ چلتی ہیں مگر پر چھائیاں

ہم نے وہ منظر بھی دیکھا ہے اثر
بولتی ہیں دار پر سجائیاں

توکلؑ



نہیں کیا آسماں پر

تیرا ایماں

بتا۔ زندگی

کیوں ہے

سراسیمہ پریشاں

کہ تیرا زخم خود ہے تیرا درماں

••



نظر سے دور ہے پھر بھی نظر میں رہتا ہے
چراغ بن کے مری رہ گزر میں رہتا ہے

اُجڑ چکی ہے یہ بستی مگر وہ شخص ابھی
بڑے خلوص سے دل کے کھنڈ میں رہتا ہے

نہ جانے دن کے اُجلے میں کیوں نہیں ملتا!
تمام رات مری چشم تر میں رہتا ہے

میں ڈھونڈتا ہوں تو مجھ کو نظر نہیں آتا
وہ ایک شخص جو میسر ہی گھر میں رہتا ہے

راہ نمشا



وہ خود تو تیرھے میڑھے راستوں پر

گامزن ہے

مگر رستہ دکھاتا ہے

جورستہ

عافیت اور عاقبت کا ہے

••



جیسے مہکی ہوئی یادوں کا ہو جھونکا کوئی
 غم کے صحرا میں کچھ اس طرح در آیا کوئی
 نیند پلکوں پہ گراں بار ہوئی جاتی ہے
 دل کی رگ رگ میں ابھرتا ہے سراپا کوئی
 آئینہ بھی تو نہیں پاس کہ خود کو دیکھوں !
 میری مانند نہ ہوگا کہیں تنہا کوئی
 اب نئے لفظوں کے موسم کی خبر دیتا ہے
 فکر کی دھوپ میں جلتا ہوا سایا کوئی

کس خرابے میں تو اسے عمر رواں چھوڑ گئی
کرب احساس کا ملتا نہیں لمحہ کوئی

شمع رخسارِ نگاراں بھی ہے مدھم مدھم
کس طرح دیکھے بھلا زخم کا چہرہ کوئی

دل کے دروازے پہ دستک تو ہوئی ہے لیکن
دیکھنا کون ہے اپنا کہ پرایا کوئی

جانے کیوں آج ترے شہر میں دیوانے پر
ایک پتھر بھی کسی نے نہ اٹھایا کوئی

کم سے کم اتنا دعاؤں میں اثر ہو پیدا
ہاتھ اٹھاؤں تو ملے دشت میں صحرا کوئی



مناجات



وحشتوں کے سراب موسم میں
 بے گناہی بھی جرم ٹہرے گی
 اب عقیدوں کے اوڑھنے سے کیا
 فلسفے ریزہ ریزہ بکھرے ہیں
 قتل گاہیں قدم قدم رکھیں
 آج جیسے بھی ہیں غنیمت ہیں
 کل کے بارے میں سوچنا کیا ہے
 دھند پھیلی ہوئی ہے چار طرف
 جسم اور روح دونوں پڑمردہ
 المسدد!
 دو جہان کے مالک

••



خیال یار وہ سورج جو ڈوبتا ہی نہیں
نظر نظر کو اندھیروں سے واسطہ ہی نہیں

متمہاری آنکھ کا آئینہ میری ذات میں ہے
یہ راز وہ ہے کوئی جس کو کھولتا ہی نہیں

زباں خموش ہے بھی تو آنکھ بول اٹھے
دلوں کا درد چھپائیں یہ حوصلہ ہی نہیں

میں اپنے غول سے باہر نکل سکوں کیسے
حصارِ جسم کچھ ایسا ہے ٹوٹتا ہی نہیں

کہاں کٹا مری آرزوؤں کا سورج
کبھی خیال کا پر تو یہ پوچھتا ہی نہیں

مجھے حیات کی بیداریوں کا غم کیوں ہو
خمارِ نیم شبی ہے کہ ٹوٹتا ہی نہیں



طیرِ آوارہ



رات دل کے آنگن میں
 ایک طیرِ آوارہ
 سیٹیاں بجاتا ہے
 مَن کو گدگداتا ہے
 تیرگی کے جنگل میں، صبح کی کرن چمکی
 اور وہ طیرِ آوارہ
 آپ اپنے زنداں میں پھر سے ہو گیا محبوس !

••



دن کا ماتم ہے روشنی کم ہے
ماہ و انجسم کی آنکھ پر غم ہے

صبح اک سنگِ میل خوشیوں کا
رات تو صرف وقفہ غم ہے

زندگی کیسا ہے اک رم آہو
استعارہ ہے اور مبہم ہے

اب تو اُمید کا دیا بھی نہیں
سانس رکتی ہے زندگی کم۔

ہم نہیں جانتے خوشی کیسا ہے
آنکھ پر غم تھی، آنکھ پر غم ہے

پھر وہی تیسرگی، وہی افسوس
زلف کی برہمی کا ماتم ہے

نکر سے آنچ اٹھ رہی ہے اثر
شاعری کا مزاج برہم ہے



ت



اتر تری رات کے زینے سے لگ کر سوچتا ہوں
صبح جب ہوگی

میں اپنی جستجو میں چل پڑوں گا
ساعتوں کے ٹوٹتے صحرا سے نکلوں گا
نئی منزل 'نیا جادہ' اجالا ہی اجالا
دور تک انسانیت کا بول بالا
خیال اچھا ہے خود کو بھول جانے کا
چلو یوں بھی تو کر دیکھیں ...

••



سائنس لیتا ہوا بے برگ شجر کیسا ہے
 برف باری میں یہ جلتا ہوا گھر کیسا ہے

اب کے واپس کوئی آجائے تو اس سے پوچھیں
 غیر آباد علاقے کا سفر کیسا ہے

کوئی چہرہ بھی دکھائی نہیں دیتا مجھکو
 یہ دھواں دیکھئے تا حد نظر کیسا ہے

میری آواز میں آواز ملا دیتا ہے
میکر اندر وہ جو پنہاں ہے بشر کیسا ہے

تیرہ بختوں کی نگاہوں میں کہاں ہے سوج
شب کا افسانہ بعنوان سحر کیسا ہے

ہر طرف پھیلا ہے گم گشتہ فضاؤں کا دھواں
کوئی دیکھے یہ سراپوں کا نگر کیسا ہے

اب کے فرصت جو ملے ہم بھی ادھر ہو آئیں
شاعری کرنے کا یاروں میں ہنریا۔ یہ

ساری دنیا کی نگاہوں میں اثر کچھ بھی سہی
فیصلہ آپ کو کرنا ہے اثر کیا ہے



ڈاکٹر زور کی نذر



کس عرق ریزی سے مخطوطہ شناسی کی ہے
 کیسے کیسے دُرِ نایاب نکالے ہوں گے
 ایک اک لفظ کے سینے میں اُترنے کیلئے
 کتنے دیمک زدہ اوراق کھنگالے ہوں گے



۱۔ مشہور محقق اور ماہر دکنیات ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

حرفِ نم دیدہ



ستارے ٹچے رہے ہیں زندگی تقسیم ہوتی ہے
سرِ مژگاں کوئی شے شبِ بنی تقسیم ہوتی ہے

بنامِ ہوش یاں دیوانگی تقسیم ہوتی ہے
مہارے شہر میں بے چہرگی تقسیم ہوتی ہے

دکن کی سرزمین ہے اب بھی روشن نورِ دانش سے
دیارِ علم و فن میں آگہی تقسیم ہوتی ہے

شعورِ حریت جب ڈوب جائے گا اندھیر میں
تو دیکھیں کس افق پر بندگی تقسیم ہوتی ہے

اُشردل کے افق پر پھر نیا سورج ابھر آیا
نفس کی آگ 'غم کی روشنی' تقسیم ہوتی ہے



جنگل میں صداؤں کے سنائی نہیں دیتا
وہ بھیڑھے چہرہ بھی سمجھائی نہیں دیتا

بے چین ہوں آفاق کی وسعت میں بکھرنے
کیوں جسم کے زنداں سے رہائی نہیں دیتا

برسات میں وہ بھیگتا رہتا ہے خوشی سے
آندھی میں بھی وہ پیڑ دہائی نہیں دیتا

وہ حق جو رفاقت کی روایت کا ایسا ہے
وہ حق بھی تو اک بھائی کو بھائی نہیں دیتا

بے مانگے بھی دے دیتا ہے شایہ کسی کو
اور مانگنے والے کو گدائی نہیں دیتا

پڑ جائے اگر وقت تو اس دور میں کوئی !
پرست تو بڑی بات ہے رائی نہیں دیتا

ہو دیدہ بینا تو نظر آئے گا تم کو !
غم ہر کس و ناکس کو دکھائی نہیں دیتا

وہ شخص جو رہتا ہے اثر آنکھ میں ہر دم !
حیرت ہے کہ خود مجھ کو دکھائی نہیں دیتا



منظر بدل ڈالو



سکوں نا آشنائیاں میں جینا

جنوں کا حوصلہ رکھنا

اگر جی کا زیاں ٹہرے

تو پھر

منظر بدل ڈالو

• •



کسی کا نقش جو پل بھر رہا، آنکھوں میں
بڑے خلوص سے گھر کر رہا ہے آنکھوں میں

زمین سے تابہ ثریا ہے روشنی لیکن
یہاں تورات کا منظر رہا ہے آنکھوں میں

چلا گیا ہے تصوّر کی سرحدوں سے پرے
وہ ایک شخص جو اکثر رہا ہے آنکھوں میں

ابھی ابھی کوئی شہر طرب سے گذرا ہے
کسے دکھاؤں دھواں بھر رہا ہے آنکھوں میں

تری نظریں مروت اگر نہیں نہ سہی
مرا خلوص برابر رہا ہے آنکھوں میں

برادرِ مبراہیم خلیل کی نذر

سیٹیر - مٹا اور

SEARS TOWER



یہ منارہ آسمان کا ہم نشین

دیکھنا اُجھک کر زمین

اس بلندی سے

بلندی پر

کوئی منتظر نہیں

••

عل دنیا کی سب سے بلند عمارت (شکاگو)

حرفِ نم دیدہ



یہ دیکھنا ہے کہ کس سمت جانا نکلتی ہے
گلوں کو چوم کے بارِ صبا نکلتی ہے

نہ کوئی شور نہ آہٹ نہ چاپ قدموں کی
کس احتیاط سے ملنے کو آ نکلتی ہے

وہ ایک لڑکی جسے زعمِ خود شناسی ہے
کلاسِ روم سے اکثر خفا نکلتی ہے

وہ بن سنور کے نکلتی ہے جس گھڑی گھر سے
خمشویوں کے بھی لب سے صدا نکلتی ہے

دروغ مصلحت آمیز کے خرابے میں
ذرا سی بات بہت دور جا نکلتی ہے

تمام عمر مرادِ دل دکھا ہے جس کے سبب
اُسی کے حق میں برابر دعائے نکلتی ہے

تو اپنے قد پہ نہ نازاں ہوا بے نگارِ حیات
کہ زندگی ترے قد سے ذرا نکلتی ہے

نسیم صبح کے ہلکے سے ایک جھونکے سے
کلی کلی کے بدن سے قبا نکلتی ہے

گھٹا کی طرح تمہیں پھیل جاؤ سر پہ آشر
حیات دھوپ میں بے آسرا نکلتی ہے



نصاب عقل کا اک باب



روایت کو پڑھو

پھر
حرفِ تجدید تم کو
الجمنا اور اڑنا بھی

نصاب عقل کا اک باب ہے
بے شک

زمانہ مدر ہے

پھر
اس کے بعد یہ سوچو
کتابِ زندگی کیا ہے

••



آغاز انوکھا ہو تو انجام نیا ہو
وہ درد عطا کر جو کسی کو نہ ملا ہو

ممکن ہے کہ فرقت ہی میں آجائے میسر
کچھ ایسا سکول جو تری قربت سے سوا ہو

بے وجہ پریشانی خاطر نہیں یارو!
شاید مجھے صحرا میں کوئی ڈھونڈ رہا ہو

یہ سوچ کے روتا ہوں کہیں بھول نہ جائے
جس شخص کو بھی میں نے بہت یاد کیا ہو

پیغام نمولائے بہاراں تو مجھے کیا
وہ برگِ خزاں دیدہ ہوں جو ٹوٹ گیا ہو

یہ فکرِ سخن ہے اشعر جذبہ — نام
شاید سرے اندر سے کوئی بول رہا ہو

واہمہ اصلِ حقیقت



اترتی رات، پڑھتا دن
 کبھی نرمی، کبھی گرمی، کبھی سردی
 کبھی خواہش، کبھی کام و دہن کی آزمائش
 ذائقہ کڑوا، کھیلا، انگیس جیسا
 شب و روز تمنا، خواہشوں کی مصنوعی جنت
 اب آگے سوچنا بیکار ہے
 ہر واہمہ اصلِ حقیقت ہے۔

••



منظر ایسا بھی سہانا تھا وہاں
جی لگانے کا بہانا تھا وہاں

راستے بھاگ رہے تھے لیکن
میں ہی سہما ہوا ٹھہرا تھا وہاں

دھوپ بہتی ہوئی ندی جیسے
وہ کہ برگدسا اکیلا تھا وہاں

رات روشن تھی، سجیلی تھی مگر
دن جو نکلا تو اندھیرا تھا وہاں

ہم بھی کچھ وقت گزاریے اثر
رنگ اور روپ کا میلہ تھا وہاں

شاذت کمیت کی یاد میں



بادِ صرصر نے کیا کہا آخر
پھول کیوں شاخ سے گرا آخر

ایک بہتی ہوئی ندی تھا وہ
ریت کس طرح بن گیا آخر

جس کا ہر شعر تھا تراشیدہ
ایسا ہیہرا کدھر گیا آخر

چھوڑ کر ادھ کھلی بیاضِ شام
کون سوئے افق چلا آخر

اس کا ہر خواب نیم خواب رہا!
اشک۔ بن کر جو بہ گیا آخر

ہر ورق انتخا۔ تھا جس کا
چار سو منتشر ہوا آخر

رات بھر جاگتا رہا لیکن
دن نکلتے ہی سو گیا آخر

ایک نغمہ سماعتوں میں تھا
وہ بھی خاموش ہو گیا آخر

کیوں اُشر ہو نہ سنگ باری کا
آئینہ آئینہ ہی تھا آخر



کتبہ



کتبہ اشاداب شہر تھا پہلے
 آج ہر موڑ پر گھٹن سی ہے
 جشن کا اہتمام کیا کیجئے
 اپنی تہذیب ہی سسکتی ہے

••



ہم کربِ مسلسل سے گذر کیوں نہیں جاتے
سانسوں کے یہ طوفان ٹہر کیوں نہیں جاتے

کب تک یوہنی بھٹکے گے تمنا کے مسافر
ماضی کے سمندر میں اتر کیوں نہیں جلتے

برگد کی طرح برسوں سے ٹہرے ہیں زمیں پر
لمحات کے مانفد گذر کیوں نہیں جلتے

حالات کے صحرائیں بھٹکتے ہوئے راہی
حیرت ہے سرِ شام بھی گھر کیوں نہیں جاتے

زوال



مشینی زندگی جینا
 بٹن کے ساتھ حرکت اور حرارت
 لمس کا احساس کر جانا
 تقاضا تو نہیں، لیکن
 ہنر ٹہرے تو کیا کیجئے

••



غزل مزاج ہے، یکسر غزل کا لہجہ ہے
سراپا جیسے نزاکت کا استعارہ ہے

قدم قدم پہ چراغوں کی سانس رکتی ہے
کہ اب تو شہروں میں جینا عذاب لگتا ہے

جھلستی شام بدلنے لگی ہے پیراہن
ترے بدن کی تمازت میں سحر کیسا ہے

شگفتہ حرفِ نوا اجنبی سے لگتے ہیں
 ادا اس لفظوں سے اپنا قدیم رشتہ ہے

نہ موسموں میں مہکے نہ رنجگوں میں اثر
 تمہارے شہر کا موسم بھی کتنا پھیلا ہے

چہار سمت خیالوں کی ریت بکھری ہوئی
 ہماری پیاس کا منظر یہ ریگ صحرا ہے

اب اپنی تشنہ لبی پر نہ جا ئے گا اثر
 سمن دروں کا محافظ بھی آج پیاسا ہے



دو نظمیں

۱

سچ کی ہر کڑواہٹ پینا
ہر مشکل لمحہ کو جینا
سب کے بس کا روگ نہیں ہے

••

۲

زمانہ
اک۔ اکائی ہے
اضافت ہیں
یہ امروز اور فردا

••



آنکھوں میں ہے اونگھتا سورج
کتابے نور ہو گیا سورج

شام خنجر بکف نہ تھی یوں بھی !
کیسے خوں میں ہنا گیا سورج

اُس کے چہرے سے کیسے آنکھ ہٹے
اس کا چہرہ ہے بولتا سورج

میری آنکھوں میں نیند ہے تیری
کیسے دیکھوں میں جاگتا سورج

صبح ہوتے ہی جیسے رگ رگ میں
روز اگتا ہے اک نیا سورج

شام لیٹی ہوئی تھی بستر پر !
اور کمرے میں مرگیا سورج

تم اگر اس کے سامنے آتے
رک کے اک لمحہ سوچتا سورج

راکھ ہو جاؤں گا میں شام تک
آگ لسن لسن میں ہو گیا سورج

تیرگی اوڑھ لی ہے آنکھوں پر
کیسے کہہ دوں کہ مر گیا سورج

کتنی ویران ہے حیات اثر
چاند غم کا ' نہ درد کا سورج



۱۔ زرنکارِ نور...



قوسِ قزح کا قصہ بہاروں کا سپرہن
خوشبو کہیں پہ رنگ کہیں اور کہیں کرن

دریا کے رخ پہ بہتے چراغوں کی ہے قطار
پانی میں آگ، آگ میں پانی عجب بہار

دیوارِ تیسرگی پہ چسراغوں کی انجمن
رنگ و نشاط و کیف کے نغموں کا بانگین

چہرے پر تیسرگی کے سیرے کی جستجو
 باہم نیاز و ناز کی تقریب۔ کو بہ کو

دلہیزِ آرزو پہ دیئے جگمگاتے ہیں
 تقدیسِ زندگی کے ترانے سناتے ہیں

احساسِ رنگ و بو کے مہکتے ہوئے غبار
 تجھ پر ہیں نورِ سپیکر و خوشبو بدنِ نثار

انسانیت نواز روایا۔۔۔ کی امیں !
 زندہ رفاقتوں کی چمکتی ہوئی جبین

وابستہ تجھ سے کتنی حکایا۔۔۔ دل پذیر
 اے زرنگارِ نور کہاں ہے تری نظیر

مردہ دلوں میں تازہ شگوفے کھلاتی ہے
 مژدہ نئی رُتوں کے سفر کا سناتی ہے

پیکر ترا نگارِ سحر کی نوید ہے،
یہ جشنِ نورِ فتح و ظفر کی نوید ہے

ارضِ دکن کو جلوہٴ صدرنگ و بولکھیں
اس پیکرِ حسیں کو اثرِ سرخ رو لکھیں

قطعہ

یاس کے بے کراں سمندر میں
زندگی ڈوب ڈوب جاتی ہے
کوئی چہرہ نظر نہیں آتا
جب کبھی تیسری یاد آتی ہے



نقد و تحقیق کی راہوں میں اُجالے ہوں گے
کل کتابوں میں ہمارے بھی حوالے ہوں گے

تیری قامت کو جو آئینہ دکھا دیتے ہیں
تیرے ناقد ہی ترے چاہنے والے ہوں گے

اس کی سانسوں میں بھی زخموں کا سورا ہوگا
میری آنکھوں میں بھی یادوں کے اُجالے ہوں گے

کل مری دشت نودی تجھے تڑپا۔ گی
تیری نظروں میں مرے پاؤں کے چھالے ہوں گے

اور کچھ روز جو اردو کا یہی حال رہا
بس کتب خانوں میں اخبار رسالے ہوں گے

چار سو سال گزرنے پر یہ اندازہ ہوا!
اپنی تہذیب۔۔۔ آداب نرالے ہوں گے

دوب کر فکر و معانی کے سمندر میں اثر
کتنے لفظوں کے گہر ہم نے نکالے ہوں گے



انعام

سلسلہ کام کرنا ہی
 ترا انعام ٹھہرا۔
 مگر تو زندگی جینے میں سرگرداں
 سراسیمہ پریشاں
 ..

راہِ نجات

تیرگی سے نہ آنکھ پھیر اپنی
 تیرگی روشنی کا حصہ ہے
 ..



دوستوں سے عمر بھر لڑتے رہے
دشمنوں کے واسطے اچھے رہے

سایہ سایہ زندگی چلتی رہی
فاصلے گھٹتے رہے بڑھتے رہے

لوگ آئینوں کی صورت تھے مگر
خوف تھا ایسا کہ سب ڈرتے رہے

راستوں کے پیچ و خم کے باوجود
دل کی بستی کی طرف چلتے رہے

زندگی قسطوں میں لکھی تھی اثر
ہر نئے غم کو لئے ہنستے رہے

ذوقِ مطالعہ



بدن کی شاعری
 بے حرفِ نظمیں
 لکیریں اڑھئی ترچھی سی
 کہیں گولائیاں روشن
 عمودی خط
 خفی اور بیضوی حلقے
 اسے پڑھنے سے کیا حاصل
 کتابوں کے ورق الٹیں
 تلاشیں
 ایک چہرے کو
 اُسے ڈھونڈیں کہ جی پہلے ہمارا

••



دلوں کے درد کا رشتہ مری تلاش میں ہے
کسی کا عہدِ تمتّٰم مری تلاش میں ہے

وہ شخص مجھ سے بچھڑ کر بھی جو ادا اس رہا
سنلے اب وہ دوبار مری تلاش میں ہے

نہ جانے کون سے تعاقب میں ہے کوئی سایا
کسی کا نقشِ کفِ پا مری تلاش میں ہے

کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دیتی ہے
یہیں کہیں کوئی سایا مری تلاش میں ہے

نہ جانے کون تھا صحرا میں جس کو دیکھا تھا
وہ ایک شخص مجھ سے مری تلاش میں ہے

وہ لمحہ جس کو میں صدیوں سے ڈھونڈتا ہوں اثر
سنلے اب وہی لمحہ مری تلاش میں ہے



متاعِ عمرِ گزشتہ سمیٹ کر لے جا
جو ہو سکے تو مرادِ اپنے گھر لے جا

تو جا رہا ہے تو میری سسکتی آنکھوں سے
سلگتی شام، بچھلتی ہوئی سحر لے جا

اُچھلتی آنکھوں سے تہذیب کا سفر کیسا
تو اپنے آپ کو تاریخ کے ادھر لے جا

حضورِ دوست اک آئینہ جگمگاتا ہے
تو اپنی ذات کا پیکر تراش لے کر لے جا

سلگ ہی ہے تری یاد میری رگ لے گئی
اب اپنی یاد میرے دل سے چھین کر لے جا

اثر کے پاس تو کچھ بھی نہیں ہنر کے سوا
تو بے ہنر ہے تو سرِ پایہ ہنر لے جا



تم اتنا جانتے ہو تو



اُسے لکھتے ہوئے ڈرتا ہوں

وہ ابلاغ ہے میرا

اُسے کہتے ہوئے رکتا ہوں

وہ احساس ہے میرا

اُسے پڑھتے ہوئے اکثر بڑھتا ہوں 'آخر کیوں

قلم، کاغذ، سیاہی اور متن

سب کچھ وہی ہے

ابھی جیسے کمی ہے

تم اتنا جانتے ہو تو

مجھے پرکھو، مجھے جانچو، مجھے الخط کرو

یا پھر مجھے تسلیم کرو

••



کتنی راتوں سے جل رہا ہوں میں
جاگتے زخیم کا دیا ہوں میں

مجھ سے خود کو بچا کے یوں نہ نکل
زندگی تیرا آئینہ ہوں میں

میرے لہجے میں بولتا ہے تو
اپنی آواز سن رہا ہوں میں

ریزہ ریزہ بکھر رہی ہے حیات
لمحہ لمحہ گچھل رہا ہوں میں

کوئی اپنا پتا بتائے مجھے؟
خود کو مدت سے ڈھونڈتا ہوں میں

عمر رفتہ کے ریگزاروں پر
نقش پا اپنے ڈھونڈتا ہوں میں

تو نے کانٹا سمجھ لیا تھا مجھے
دیکھ! پلکوں پہ کھل رہا ہوں میں

بعض اوقات یوں ہوا ہے اشر
اپنے سایے سے ڈر گیا ہوں میں



فاصلہ



نئی تاریخ کے صفحوں پر کیا لکھیں
 اگر سوچیں
 سبھی کچھ یوں ہے
 جیسے زندگی مقتل میں لرزاں ہو
 حکایت سے شکایت تک
 وہی اک فاصلہ قائم

••

نور شہید احمد جامی کی نذر



سراب دُور سے دریا دکھائی دیتا ہے
”ترا خیال بھی تجھ سا دکھائی دیتا ہے“

نہ جانے کتنے ستاروں کا دل جلا ہوگا
سرافق جو اجالا دکھائی دیتا ہے

جہاں جہاں نگہ جستجو ٹہرتی ہے
کسی کا نقشِ کفِ پا دکھائی دیتا ہے

چھپی ہوئی ہے کوئی آگ ان نگاہوں میں
مرا وجود پگھلتا دکھائی دیتا ہے

کلی چٹکنے کے عالم پہ چونک اٹھا ہوں
سنا ہوا کوئی لہجہ دکھائی دیتا ہے



گنگناتی ہے غزل گاتی ہے
جب بھی ملنے کو چلی آتی ہے

دل کے گلشن میں بڑی رات گئے
روشنی سی کبھی ہو جاتی ہے

درد کی آگ میں تپتی ہے تو پھر
شاعری دادِ ہنس رپاتی ہے

نغمہ و شعر ہے ہر عضو بدن
کس قدر شوخ وہ مدامتی ہے

آرزوِ حسن کی دنیا سے اثر
غم کی سوغا - اٹھالاتی ہے

ایک نظم



جو ہم چھلکاٹیں جامِ ارغوانی
 بہک جائیں سبھی
 غنچے چٹک جائیں
 بدلیاں گھر گھر کے آئیں
 اور کہانی اک نئی رت کی سنائیں
 دف بجا کر گیت گائیں
 مگر وہ تشنگی ہے
 جیسے مینجانہ نہیں، صحرا میں تپتے ہیں
 وہی موسم، وہی جلتی ہوئیں
 خوف کے عفریت بادل
 نہ شادابی، نہ سرسبزی
 فضا یرقان جیسی چار سوسہ



توجہ احساس پہ لہراے گا آغسل بن کر
پھیل جاؤں گا تری آنکھ میں کا جل بن کر

دشتِ احساس میں اک شخص کا شبِ ہم لہجہ
پیا س ہونٹوں کی بھجھا دیتا ہے چھاگل بن کر

شام ہوتے بکھر جاؤں گا سناٹے میں
اُس کی دہلیز پہ رن جاتا ہوں سچل بن کر

ایک پرچھائیں مرے ساتھ رہا کرتی ہے
 کبھی خوشبو، کبھی آہٹ، کبھی آنچل بن کر
 ق

ایک آواز مری نیند میں گھل جاتی ہے
 کبھی نغمہ، کبھی بریط، کبھی پایل بن کر

اس کو احساس کے آنکھ میں ہٹھا کر دیکھو
 درد سینے میں ہبکا ٹھے گا صندل بن کر

ایک رتے ہوئے جوگی کی طرح ہم بھی اثر
 شہر و صحرا میں بھٹکتے رہیں بادل بن کر





اک حسین یاد پھر ساتھ چلنے لگی
پھول کھلنے لگے شمع جلنے لگی

جلنے کس کے لئے میری دیوانگی
منزلوں سے بھی آگے نکلنے لگی

تیسرگی میں چلنے لگے راستہ
پیار کی آگ سینوں میں جلنے لگی

بڑھ گئی وقت کی تیسرگی اور بھی
جب کرن آرزو کی محسنے لگی

اے آشر ایک بے نام سی آگ میں
جیسے خود صبح امیتد جلنے لگی

پرانے تماشے



اُترتی شام سے پوچھیں گے
 جگنوؤں کا مزاج
 جنوں کے شہر میں
 راتوں کا کیا ہوا آخر
 افق پہ یوں تو سمٹ آئے تھے
 نئے منظر
 سلگتی آنکھوں میں حسرت
 ہراس
 تنہائی
 تمام شہر تماشا بنا تھا
 حیراں تھا
 مگر جب آنکھ کھلی
 وہی پرانے تماشے تھے اور ماری نئے

••



ٹوٹے ہوئے الفاظ کو آہنگ نیادے
قرطاس پہ آواز کی تصویر بنادے

ہر لفظ پہ مفہوم کا جامہ نہیں ہوتا
اظہار کو اسلوب کی خوش رنگ قبادے

تنقید کی بنیاد میں تحقیق چھپی ہے
تشکیک کی راہوں سے حقائق کا پتادے

دیمک زدہ اوراق سے آنکھیں تو نہ پھیرو
دیمک زدہ اوراق ہیں کرنوں کے لبادے

ملبوں میں چھپے ہوتے ہیں انمول خزینے
آئینے ملیں گے تجھے پتھر تو ہٹا دے

ہر رات لکھا کرتے ہیں پریوں کی کہانی
ہر صبح کو اوراق نظر آتے ہیں سادے

دم گھٹنے لگا ہے مرا تاریک فضا میں
اب دل کی زمین کوئی سوچ بھی اگا دے

تشہیر کی بیساکھی کبھی ساتھ نہ دے گی
لہجہ کو اشرا اپنے تو پہچان بنا دے





ٹوٹ کر رہ گیا آئینے سے رشتہ اپنا
 ایک مدت ہوئی دیکھا نہیں چہرا اپنا
 لفظ و معنی کے نئے پھول ابھر آئیں گے
 نقش ہو جائے جو قرطاس پہ لہجہ اپنا
 کوئی طوفان ہے نہ اب کوئی تلاطم دل میں
 ساحلِ درد پہ ٹہرا ہے سفینہ اپنا
 یادِ خوشبو ہے چھپانے سے کہاں چھپتی ہے
 موجِ گلِ خود ہی بنا لیتی ہے رستہ اپنا
 جس کے جانے سے منور ہوئے ہلکے چراغ
 آج تک اس نے دکھایا نہیں چہرا اپنا
 رات کے ساتھ اشر لوٹ کے گھر جانا ہے
 راستہ دیکھ رہا ہو گا درحیہ اپنا

قطعہ تاریخ طباعتِ حرفِ نم دیدہ

تصنیفِ استادِ محترم ڈاکٹر محمد علی اشردام اقبالہ

بوستانِ شعر و فن ہے متقی
یا یہ دیوال ہے ریاضِ قافیہ
لکھ سیرِ اعجاز سے تاریخِ طبع
حرفِ نم دیدہ بیاضِ قافیہ

۱۴۱۱ ہجری

نتیجہٴ مخلص

ایم۔ عباس متقی

ایم۔ لے ایم فل (جامعہ عثمانیہ)

مصنف کی دیگر کتابیں

--- دکنی غزل کی نشوونما (۱۹۸۶ء) اتر پردیش، مغربی بنگال، بہار اور آندھرا پردیش
اردو اکیڈمی سے ایوارڈ یافتہ۔ مدراس یونیورسٹی کے ایم۔ فل اور آندھرا پردیش اردو اکیڈمی
سے ایوارڈ یافتہ۔ مدراس یونیورسٹی کے ایم۔ فل اور جامعہ عثمانیہ کے ایم۔ اے کے نصاب میں
شامل۔

--- دکنی اور دکنیات (۱۹۸۲ء) آندھرا پردیش اردو اکیڈمی سے ایوارڈ یافتہ اور
مدراس یونیورسٹی کے ایم۔ فل کے نصاب میں شامل
--- دکنی اور دکنیات پاکستانی ایڈیشن (۱۹۸۶ء) مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد
--- دکنی شاعری - تحقیق و تنقید (۱۹۸۸ء) آندھرا پردیش اردو اکیڈمی سے ایوارڈ یافتہ
--- دکنی کی تین مثنویاں (۱۹۸۷ء) مدراس یونیورسٹی کے نصاب متن میں شامل۔
--- دبستان گوکنڈہ - ادب اور کلچر (۱۹۸۱ء) مرتبہ
--- غواصی - شخصیت اور فن (۱۹۷۷ء) آندھرا پردیش اردو اکیڈمی سے ایوارڈ یافتہ
--- ملاقات (شعری مجموعہ) (۱۹۸۰ء) مغربی بنگال اور آندھرا پردیش اردو اکیڈمی سے
ایوارڈ یافتہ

--- شمع جلتی رہے (رپورٹائر) (۱۹۸۰ء)
--- تذکرہ مخطوطات ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد (جلد ششم) (۱۹۸۳ء) بہ اشتراک
محمد اکبر الدین صدیقی

--- نظیر شناسی (مرتبہ) (۱۹۸۷ء) بہ اشتراک ڈاکٹر اکبر علی بیگ
--- کلیات ایمان (۱۹۸۷ء) مرتبہ سیدہ ہاشمی ترمیم و اضافہ محمد علی اثر
--- تلاش اور تحقیق (مضامین کا مجموعہ) - زیر طبع